باب۔ ۲۲

ترجمہ

فص الیاسیہ

حکمت ایناسیہ

شیخ (ابن عربیؒ) کا خیال ہے کہ:

الیاس علیہ السلام ہی ادریس علیہ السلام ہیں۔ ادریسؑ، نوح علیہ السلام سے پہلے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے (انھیں) مکانِ بلند پر اٹھالیا۔ وہ وسط افلاک یعنی فلکِ شمس میں ساکن ہیں۔ شیخؒ کے خیال میں فلک سے نزول فرماکر قریۂ بعلبک کی طرف مبعوث کیے گئے۔ بَعَل ایک بُت کا نام ہے اور بَک اُس قریے کا سلطان تھا۔ بعل بُت، سلطان کے ساتھ خاص تھا۔

الیاسؑ، جو پھر ادریسؑ کہلائے، عالم مثال میں کیا دیکھتے ہیں کہ کوہِ لبنان پھٹ گیا ہے {لُبانہ بمعنیٰ حاجت سے مشتق ہے} اور اس میں سے ایک آتشیں گھوڑا نکلا۔ اس کا ساز و سامان سب آتشیں تھا۔ الیاسؑ نے اس کو دیکھا تو اس پر سوار ہوگئے۔ اور ان کی شہوتِ نفسانی ساقط ہوگئی اور وہ عقلِ بلا شہوت رہ گئے۔ ان کو اغراضِ نفسانی کی چیزوں سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اس حال میں حق تعالیٰ ان کے پاس منزّہ تھا۔ گویا ان کی معرفت باللہ نصف رہ گئی، اور ایک جانب کی ہوگئی۔ (شانِ) تشبیہ سے ان کی نظر منقطع ہوگئی اور فرشتہ صفت آدمی ہوگئے۔ اس لیے کہ عقل جب وہم و خیال سے مجرد ہو جاتی ہے اور علم (عقلی نہیں بلکہ) نظری ہی نظری رہ جاتا ہے تو اس کی معرفتِ الٰہی بھی شانِ تنزیہ کی ہوتی ہے نہ کہ شانِ تشبیہ کی۔ اور جب صاحبِ عقل پر اللہ تعالیٰ کے تجلیات ہوتے ہیں (اور) اس کی معرفت کامل ہوتی ہے تو وہ ایک جگہ تنزیہ کا قائل ہوتا ہے، اور ایک جگہ تشبیہ کا۔ وہ وجودِ الٰہی کو تمام صورِ طبیعیہ و عنصریہ میں سرایت کرتا ہوا پاتا ہے۔ اس کے پاس کوئی صورت نہیں رہتی، مگر یہ کہ اس کی ذات کو ذاتِ حق سے جدا نہیں سمجھتا۔

یہ معرفتِ تامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس سے منزّل شرائع ان کو لے کر آئے ہیں، اور تمام اوہام واحساسات وتصورات اسی کا حکم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نشاءتِ انسانی (یعنی انسان کی ترقی) میں عقول سے زیادہ اوہام کا غلبہ ہے۔ کیوں کہ عاقل، مراتبِ عقلی میں کتنی ہی ترقی کرے مگر تعقل میں حکم ووہم وتصور سے خالی نہیں رہتا۔

پس وہم، سلطانِ اعظم ہے۔ اس صورت کاملۂ انسانیہ میں اور آمیزشِ وہم وتصور کے ساتھ شرائع الٰہیہ اترے ہیں۔ شرائع میں تشبیہ بھی ہے اور تنزیہ بھی۔ تشبیہ ہے تو وہم سے تنزیہ کے ساتھ۔ تنزیہ ہے تو عقلی تشبیہ کے ساتھ۔ پس تشبیہ وتنزیہ دونوں آپس میں ملے جلے ہیں۔ تنزیہہ، تشبیہ سے خالی نہیں اور تشبیہ، تنزیہہ سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ (سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۱ میں) فرماتا ہے، لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (یعنی اس کے جیسا کوئی نہیں)۔ اس آیت میں دو احتمال ہیں۔

۱۔ کاف زائد: اس تقدیر پر معنیٰ یہ ہوں گے۔ اس کے جیسا کوئی نہیں۔ یہ تنزیہ ہے۔

۲۔ کاف غیر زائد: اس تقدیر پر یہ معنیٰ ہیں۔ اس کے مثل کے جیسا کوئی نہیں۔ یعنی اس کی تجلّی مثالی کے برابر کوئی نہیں۔ یہ تشبیہ ہے۔

(اسی آیت میں آگے ہے) ،وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ، (یعنی) وہی ہے سننے والا اور دیکھنے والا۔ یہ تشبیہ ہے۔ یہ بڑی زبردست آیت ہے جو تنزیہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اس کے باوجود 'کاف' کی وجہ سے تشبیہ سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو سب سے زیادہ جانتا اور واقف ہے۔ اس نے اپنی ذات کی تعبیر اور بیان (میں) تو ایسا ہی فرمایا ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔

پھر (اللہ تعالیٰ سورۃ الصّافات کی آیت ۱۸۰ میں سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ) فرماتا ہے، (یعنی) پاک ہے تیرا رب {یا محمدؐ!} صاحبِ عزت {و قوت} ان اوصاف سے کہ {عقل والے} بیان کرتے ہیں۔ اللہ کی صفت، اہلِ عقل وہی بیان کریں گے جس کو ان کی عقلوں نے دیا۔ جو ان کی سمجھ میں آیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان اہلِ عقل کی تنزیہ سے بھی تنزیہ کی، اور خود کو اس سے پاک ظاہر کیا۔ اہلِ عقل کی تنزیہ کیا ہے۔۔؟ ایک قسم کی تحدید (یعنی محدود کر دینا) ہے۔ کیوں کہ ان کے عقول عاجز وقاصر ہیں کامل تنزیہ کرنے سے۔

تمام شرائع ایسے احکام لے کر آئے ہیں جو تصورات و اوہام میں آسکیں اور ان کی صحت کا یقین کر سکیں۔ پس حق جن جن صفات میں ظاہر ہوتا ہے بغیر ظہور باقی نہ رہے۔ ادیان اور شرائع یہی کہتے ہیں اور ان ہی کو لے کر آئے ہیں۔ اُمتیں اس کو سمجھتی ہیں۔ حق تعالیٰ اُن پر تجلی فرماتا ہے، اور وہ پیغمبروں سے وراثتاً ملحق ہو جاتے ہیں، اور ان کی اتباع کرتے ہیں۔ پیغمبروں نے جو کچھ کہا وہ بھی وہی کہتے ہیں۔ اللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ، (یعنی) اللہ خوب جانتا ہے جہاں رسالت کو رکھتا ہے اور جس کو رسول بناتا ہے، (الانعام:۱۲۴)۔ پس اللّٰهُ أَعْلَمُ کی

دو توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ آیت (کا مکمل حصہ) یہ ہے، قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّـهِ، اللَّـهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ، [(یعنی) وہ کہتے ہیں ہم ہر گز ایمان نہ لائیں گے جب تک رسولانِ خدا کو جو کچھ ملا ہے ہم کو بھی نہ ملے، اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ جہاں پیغمبری کی جاتی ہے اور جو مستحق رسالت ہے، (الانعام:۱۲۴)]۔

شیخؒ کہتے ہیں کہ یہاں "رُسُلُ اللَّـه" اور "اللَّـهُ أَعْلَمُ" (کی) دو توجیہیں ہیں:

۱۔ رُسُلُ اللَّـه مبتدا (اور) اللَّـهُ أَعْلَمُ خبر۔۔۔ معنیٰ یہ ہوں گے۔ رسولانِ خدا، مظاہرِ خدا ہیں، (اللہ) جو محلِ رسالت کو خوب جانتا ہے۔

۲۔ رُسُلُ اللَّـه کا جملہ الگ، اور اللَّـهُ أَعْلَمُ الگ جملہ۔ اس جملے میں اللہ مبتدا (اور) اعلم خبر۔۔۔ یہی معنیٰ درست ہیں۔ اللہ رسولوں کی قابلیتِ وحی و استعدادِ تبلیغ کو، جو لوازم رسالت ہے، خوب جانتا ہے۔ شیخؒ کہتے ہیں (کہ) یہ دونوں توجیہیں اس آیت میں حقیقت ہیں۔ اسی لیے ہم تشبیہ فی التنزیہ اور تنزیہ فی ال تشبیہ کے قائل ہیں۔

جب یہ ثابت ہو چکا تو اب ہم متقد {یعنی پیر و عقل} اور معتقد {یعنی تاویل نہ کرنے والوں} کی بحثوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یعنی ان کے لیے مزید توضیح و تشریح نہیں کرتے۔ حالاں کہ یہ بے معرفت متقد و معتقد بھی حق تعالیٰ کی تجلی گاہوں میں سے ہیں۔ مگر ہم کو نااہل سے ستر و پردہ پوشی کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ان کی استعدادِ صور اور قابلیتِ حقائق و اعیان کا تفاضل اور کمی و زیادت ظاہر ہو جائے۔ کیوں کہ کسی خاص صورت میں تجلی کرنے والا اس صورت کی استعداد کے مطابق ظاہر ہوتا ہے۔ پھر متجلی و جلوہ گر کی طرف وہ سب امور منسوب ہوں گے جو اس صورت کی حقیقت اور اس کے لوازم کے مقتضی ہیں۔ یہ ضرور ہونے والی بات ہے۔ جیسے ایک شخص اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھتا ہے کوئی اس کا انکار نہیں کرتا۔ اور اس میں بھی شک نہیں ہے (کہ) حق تعالیٰ اس صورتِ (مرئی، یعنی دیکھی گئی صورت) کا عین ہے اور اس کی اصل و مقصود ہے۔ پس اس صورت کے، جس میں تجلی ہوئی ہے، اور اس کے حقائق کے لوازم کے موافق ہی رویت و دیدار ہو گا۔

پھر صرف تنزیہ کا قائل وقتِ تعبیر، ایک دوسرے امر کی طرف عبور اور تجاوز کرے گا، جو عقلاً مقتضیِ تنزیہ ہے۔ اور تنزیہ و تشبیہ دونوں کا قائل اور صاحبِ کشف مثالی و ایمان، اس صورت سے لفظ تنزیہ کی طرف نہ جائے گا بلکہ اس صورت کو تنزیہ کا بھی حق دے گا اور تشبیہ اور اس کے لوازم کا بھی حق دے گا جس میں اس کا ظہور ہوا ہے۔ پس اللہ حقیقتاً اشارات کے سمجھنے والے کی ایک عبارت ہے۔

اس حکمت کی روح اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امر و شانِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ مؤثر اور متاثر۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کی دو عبارتیں ہیں۔ دو اعتبار ہیں۔ پس مؤثر ہر وجہ سے ہر حال میں اور ہر حضرت و مقام میں اللہ ہی ہے۔ اور متاثر ہر وجہ سے، ہر حال میں، ہر حضرت و مقام میں عالم ہے۔

اگر کوئی شئے تمھارے سامنے آئے تو اس کو، اس کے مناسب اصل کے، ساتھ ملا دو۔ کیوں کہ آنے والا کسی نہ کسی اصل کا نوع ہوتا ہے۔ محبتِ الٰہی بندے کے نوافل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ محبت مؤثر و متاثر میں ایک اثر ہے اور اس سے حق تعالیٰ بندے کی سماعت و بصارت و قویٰ ہو جاتا ہے۔ یہ امر ثابت و مقرر ہے، اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ وہ شرع سے ثابت ہے بشرط یہ کہ تم صاحبِ ایمان ہو۔

اب رہ گیا صاحبِ عقل سلیم، وہ یا تو صاحب تجلی ہے تجلی گاہ و محلی طبعی میں، پس ہم نے جو کچھ کہا وہ اس کو سمجھتا ہے، یا مومن مسلم ہے تو اس پر ایمان رکھتا ہے۔ جس طرح کہ حدیثِ صحیح میں وارد ہوا ہے۔

جس صورت میں حق تعالیٰ کی جلوہ گری ہو ضروری ہے کہ بحث و تفتیش کرنے والے پر وہم و تخیل صحیح غلبہ کرے۔ کیوں کہ وہ اس صورتِ طبعی کے مرآۃ ہونے کا یقین اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔ مگر وہ صاحبِ عقل جو یقین نہیں رکھتا وہ خیال و وہم صحیح پر وہم فاسد کو غالب کر دیتا ہے۔ وہ اپنی نظر عقلی و فکری سے خیال کرتا ہے کہ خواب میں جو تجلی ہوئی ہے وہ حق تعالیٰ پر ناجائز و محال ہے۔ اس کو شعور بھی نہیں ہوتا اور وہم فاسد ہے کہ اس سے جدا نہیں ہوتا۔۔ اس لیے کہ وہ اپنی حقیقت سے غافل ہے۔

من جملہ اس حکم کے حق تعالیٰ عینِ صورت ہے اور امر الٰہی منقسم ہے مؤثر و متاثر میں۔ آیاتِ ذیل کے معنیٰ یہی ہیں۔ قولہٗ تعالیٰ، ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ، (یعنی) تم دعا کرو میں قبول کرتا ہوں، (غافر:۶۰)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ، أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ، (یعنی) {محمدؐ!} تم سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں تو قریب ہوں، جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں جواب دیتا ہوں، (البقرۃ:۱۸۶)۔ ظاہر ہے کہ مجیب تو جب ہی ہوتا ہے کہ داعی ہو، اگرچہ داعی کی ذات (اور) مجیب کی ذات ایک ہی ہو۔ داعی و مجیب کی صورتوں کے اختلاف میں کسی کو خلاف نہیں۔ بے شک داعی و مجیب دو مختلف صورتیں ہیں۔ یہ تمام صورتیں ذاتِ حقہ کے لیے ایسی ہیں جیسے، مثلاً زید کے لیے اعضا۔ تم کو معلوم ہے کہ زید حقیقت (میں) واحدِ شخصی ہے اور یہ کہ ہاتھ کی صورت نہ اس کے پاؤں کی صورت ہے، نہ سر کی، نہ آنکھ کی، نہ بھوں کی۔ پس زید کثیر بھی ہے اور واحد بھی۔ وہ صورتوں کے لحاظ سے کثیر ہے اور ذات کے لحاظ سے واحد ہے۔

ایسا ہی انسان، اپنی حقیقت و عینِ ماہیت کے لحاظ سے بے شک واحد ہے، اور یہ بھی بے شک ہے کہ اس کے افراد میں سے عمرو، (نہ) زید ہے، نہ خالد، نہ جعفر۔ اس میں بھی کیا شک کہ حقیقت و عینِ واحدہ کے اشخاص و افراد کا وجود غیر متناہی عند حدٍ (یعنی بے حد و حساب) ہے۔ پس وہ صور و اشخاص کے لحاظ سے کثیر ہے۔

اگر تم ایماندار ہو تو علم قطعی ہے کہ خود حق تعالیٰ بروز قیامت ایک صورت میں تجلی فرمائے گا اور لوگ اس کو پہچان لیں گے۔ پھر ایک دوسری صورت میں بدل جائے گا اور لوگ نہ پہچانیں گے۔ پھر ایک اور دوسری صورت میں بدل جائے گا اور لوگ پہچان لیں گے۔ حالاں کہ صور میں حق تعالیٰ ہی متجلی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اور معلوم ہے کہ یہ صورت وہ دوسری صورت نہیں ہے۔

گویا کہ حق تعالیٰ کی ذاتِ واحدہ، بجائے مرآت و آئینہ کے (یعنی مثلِ آئینہ) ہے۔ جب دیکھنے والا آئینۂ حق میں اپنی اعتقادی صورت متعلق بحق کو دیکھتا ہے تو پہچانتا بھی ہے اور اس کا اقرار بھی کرتا ہے۔ اگر یہ اتفاق سے آئینۂ حق ہی میں کسی اور کی اعتقادی صورت دیکھے تو اس سے انکار کر جاتا ہے۔ جیسا کہ آئینے میں اپنی صورت کے ساتھ کسی اور کی صورت دیکھے۔ پس آئینہ ایک ہے اور دیکھنے والے کی نظر میں صورتیں بہت سی ہیں۔ حالاں کہ سچ پوچھو تو خود آئینے میں ان تمام صور میں سے ایک بھی صورت نہیں۔ حالاں کہ مرآۃ و آئینے کو بھی صور میں ایک وجہ سے اثر ہے، اور ایک وجہ سے اثر نہیں بھی ہے۔ آئینے کا اثر، جو وہ کرتا ہے، یہ ہے کہ وہ شکل کو متغیر کر کے منعکس کرتا ہے۔ بڑا آئینہ بڑی صورت کو، چھوٹا آئینہ چھوٹی صورت کو دکھاتا ہے۔ اسی طرح طول و عرض کا حال ہے۔ آئینے کا اثر مقادیر (یعنی آئینے کی وسعت) میں ہے۔ مقادیر آئینے کی طرف منسوب ہوں گے۔ یہ تغیرات آئینے کی طرف اس لیے منسوب ہوں گے کہ اس کے مقادیر مختلف ہیں۔

بقدر وسع آئینہ ہوا آئینہ گر ظاہر
بنا کر آئینہ خانہ وہی محو تماشا ہے

مسئلہ زیر بحث میں متعدد آئینے نہ سمجھو بلکہ ایک ہی آئینے کو خیال کرو۔ اور وہ ذاتِ حق کو جو واحد ہے، محلِ نظر میں رکھو۔ اس لحاظ سے ذاتِ حق، غنی عن العالمین ہے۔ اور بلحاظ اسمائے الٰہیہ کے اس وقت ذاتِ حق کو متعدد آئینے سمجھو۔ جس اسم الٰہی میں تم اپنی ذات کو دیکھو یا کوئی اور دیکھے تو نظر ناظر (یعنی دیکھنے والی آنکھ) میں اُسی اسم کی حقیقت و ماہیت ظاہر ہو گی۔ واقعہ تو یہی ہے۔ اگر سمجھ گئے ہو تو نہ بے قراری کرو، نہ خوف۔ اللہ شجاعت کو دوست رکھتا ہے، اگرچہ ایک سانپ کو مارنے میں ہو۔ (یہ) سانپ کیا ہے۔۔؟ تمھارا نفس ہے۔ اس مارِ نفس کی ذات زندہ و باقی رہتی ہے۔ صورتِ خیالی اور حقیقتِ علمی و ماہیتِ ذہنی و عقلی کی بقا سے شئے کی ذات ہر گز فنا نہیں کی جا سکتی۔ گو کہ حسِ ظاہر میں صورتِ خارجی فاسد اور مٹ ہی کیوں نہ جائے۔ اس لیے کہ حد و حقیقت یعنی عین ثابتہ اس کی حفاظت کرتا ہے اور خیال یعنی عالم مثال اس کو زائل ہونے نہیں دیتا۔

یہ عدم فنا اور ذاتِ حقائق کے لیے ایک قسم کی عزت و قوت ہے۔ کیوں کہ تم حقائق کو مٹا نہیں سکتے۔ پھر اس عزت سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم فانی ہو۔ تم نے وہم و خیال پکا لیا کہ کسی کو قتل کیا، فنا کر دیا۔

مگر وہ کب فنا ہوتا ہے۔ عقل و وہم میں اس کی صورت، حقیقت میں موجود رہتی ہے۔ یہاں عقل سے مراد علم الٰہی و عین ثابتہ ہے۔ اور وہم، عالم مثال ہے کہ خیال کلّی عالم ہے۔ اس پر یہ دلیل ہے۔۔۔ (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے ،وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّـهَ رَمَىٰ،(یعنی){یا محمدؐ!} جب تم نے بظاہر پھینکا تو حقیقت میں نہیں پھینکا بلکہ اللہ ہی نے پھینکا،(الانفال:۱۷)۔ آنکھوں نے تو صورتِ محمدیہؐ ہی کو دیکھا جس کے لیے حسِ ظاہر میں رَمَیٰ، (یعنی پھینکنا) ثابت ہے۔ اسی صورت سے اللہ تعالیٰ نے نفیِ رمی بھی کی ہے، یعنی حضورؐ نے بالذات نہیں پھینکا۔ وَمَارَمَيْتَ، پھر اسی صورتِ محمدیؐ کے لیے رَمی ثابت کی گئی، باعتبار توسط اور واسطہ ہونے کے۔ إِذْ رَمَيْتَ، پھر بالذات پھینکنے والے کو صاف طور پر بیان کیا کہ وہ اللہ ہے۔ وَلَـٰكِنَّ اللَّـهَ رَمَىٰ، مگر صورتِ محمدیؐ میں۔ اس پر ایمان لانا ضروری ہے، کیوں کہ یہ آیتِ قرآنی ہے۔ اس شانِ تاثر و مؤثر کو دیکھو کہ حق صورتِ محمدیؐ میں نزول فرماتا ہے۔ دیکھو! حق تعالیٰ نے اپنے نفس کے متعلق اپنے بندوں سے اس کو فرمایا ہے۔ ہم میں سے کسی نے تو اللہ کی طرف سے یہ بات نہیں گھڑی۔ بلکہ وہ خود اپنے متعلق فرماتا ہے۔ اس کا فرمان، حق ہے۔ اس کی خبر، صادق ہے جس پر ایمان واجب ہے۔ چاہے اُس کا فرمودہ (یعنی ارشاد باری تعالیٰ) تمھاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ پھر تم یا تو صاحبِ تحقیق اور عالم ہو یا صاحبِ ایمان و تسلیم ہو۔

نظر عقلی کے ضعف پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ عقلاً فکر و نظر سے یہ حکم لگاتے ہیں کہ معلول (یعنی اثر) ہر گز علّت کی علّت (یعنی سبب کا سبب) نہیں ہو سکتا۔ یہ حکم عقلی ہے، واضح ہے۔ مگر علم تجلی و کشف میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی علّت کی علّت (یا وجہ کی وجہ)، معلول (یعنی اس کا حاصل) بھی ہو جاتا ہے۔ عقل کا یہ حکم صحیح و درست (ہو گا) بشرطیکہ کشف و شہود سے قطع نظر کریں۔ اس لیے کہ اگر علت اپنے معلول کی معلول ہو جائے تو تقدم الشئ علیٰ نفسہٖ (یعنی ذات پر فوقیت) اور دَور (یعنی تغیر) لازم آتا ہے جو محال ہیں۔ علت کے معلول، معلول نہ ہونے میں زیادہ سے زیادہ عقلِ بے کشف و شہود جو کہہ سکتی ہے، یہ ہے کہ جب دلیلِ نظری کے قیاسات کے خلاف یہ بات ثابت ہو گئی کہ ان صورِ کثیرہ میں ذاتِ واحدہ حقہ ہی ہے تو ان صور کے لحاظ سے مختلف حیثیات و اعتبارات پیدا ہوتے ہیں۔ پس وہ ذاتِ واحدہ اس حیثیت سے کہ وہ ایک معلول کی علّت ہے۔ صورتوں میں سے ایک صورت میں تو وہ علّت ہونے کی حالت و حیثیت سے معلول، معلول نہ ہو گی، بلکہ اس ذات کی صورتوں میں منتقل ہونے سے حکم بھی منتقل ہو گا۔ پھر وہ ایک اعتبار سے معلول، معلول ہو گی، تو اس کا معلول اس کی علّت ہو جائے گا۔ یہ بڑی غایت کدوکاوش عقل (یعنی یہ ایک مشکل کھوج) ہے، جب کہ حقیقتِ نفس الامری پر اس کی نظر ہو۔ اور نظر فکری ہی پر قانع نہ ہو۔ علت کے سمجھنے میں نظر عقلی کی یہ حالت ہو تو اس تنگنائے (یا تنگ جگہ) کے سوا کیا حالت ہو گی۔۔!

حق یہ ہے کہ انبیا صلواۃ اللہ علیہم سے زیادہ کوئی صاحبِ علم نہیں ہے۔ انھوں نے وہ سب چیزیں بیان کر دیں جو جنابِ الٰہی کے متعلق ہیں۔ عقل جن کو ثابت کرتی ہے ان کو بھی ثابت کیا۔ اور اس کے سوا دوسری چیزیں بھی ثابت کیں۔ جن کے ادراک میں عقل مستقل نہیں، بلکہ ان کو بالکل محال سمجھتی ہے۔ اور تجلیِ الٰہی ہوتی ہے تو اس کا اقرار کرتی ہے۔۔۔ پھر جب تجلی کے بعد تنہا بیٹھتا ہے تو جو کچھ دیکھا ہے اس میں حیران ہو جاتا ہے۔

غایت معرفت و علم ہے ناداں ہونا
سرمۂ دیدۂ تحقیق ہے حیراں ہونا

پھر اگر عبدِ رب ہے، تابعِ تجلیات ہے تو عقل کو تابعِ عرفان و تجلی کر دیتا ہے۔ اگر بندۂ نظر و فکر ہوتا ہے تو حق کو حکم عقلی کے تابع کر دیتا ہے، اور تاویل کرتا ہے۔ یہ ساری کشمکش عالم و نشاءت دنیا میں ہے۔ جب کہ دنیا میں مشغول ہو کر نشاءتِ آخرت سے محجوب (یا غافل) ہے۔ جو عارفین ہیں وہ بظاہر صورت دنیوی میں ہوتے (ہیں) کیوں کہ ان پر اس دنیا میں احکام دنیا جاری ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے باطن کو عالم آخرت کی طرف پھیر دیا ہے۔ یہ خلوت در انجمن ہے۔

دل بہ یار دست بہ کار ہے

[یعنی (اصل صوفی وہ ہے) جس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو اور اسکے ہاتھ کام کاج میں مصروف ہوں]۔

وہ ظاہری حالات کی وجہ سے پہچانے نہیں جاتے۔ مگر وہ شخص جان سکتا ہے جس کی چشم بصیرت سے اللہ تعالیٰ نے پردے اٹھا دیے ہیں۔ پس وہ عارف باللہ سے بلحاظ تجلی الٰہی کے دیکھے گا کہ وہ عالم آخرت میں ہے۔ دنیا ہی میں اس کا حشر ہو چکا ہے اور وہ قبر سے اٹھالیا گیا ہے۔ وہ ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھتے۔ اور اس کو ایسی چیزوں کا شہود ہوتا ہے جو دوسروں کو نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و توجہ خاص ہے اپنے خاص بندوں پر۔

اگر کوئی شخص اس حکمت الیاسیہ ادریسیہ کو جاننا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ حکم عقلی سے، جو شہوات کا باعث ہوتا ہے، تنزل کرے اور حیوانِ مطلق بن جائے۔ الیاس علیہ السلام کے متعلق شیخؒ کا خیال ہے کہ ان کا نام پہلے ادریس (بھی) تھا۔ وہ نوحؑ سے پہلے پیغمبر ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھالیا اور ایک زمانے کے بعد پھر رسول بنا کر زمین میں بھیجا اور اس دفعہ ان کا نام ادریس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو منزلتیں اور مرتبے عطا کیے۔

جو شخص حیوانِ مطلق ہو جاتا ہے اس کو وہ سب چیزیں معلوم و منکشف ہو جاتی ہیں جو جن و انس کے سوا دوسرے حیوانات کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس مرتبے پر پہنچ کر اس کو اپنی حیوانیت کی تحقیق ہو جاتی ہے۔

مرتبۂ حیوانیت کی تحقیق کی دو علامتیں ہیں:

۱۔ یہ کشف جو حیوانات کو ہوتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کون قبر میں عذاب دیا جاتا ہے، اور کون نعمت سے سرفراز ہوتا ہے۔ وہ میت کو زندہ، بے زبان کو متکلم (اور) بیٹھنے والے کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے۔

۲۔ ایسا شخص گونگا سا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو ہرگز کہہ نہیں سکتا۔ اس وقت اس کو مرتبۂ حیوانیت کا تحقق ہو جاتا ہے۔

شیخؒ کہتے ہیں (کہ) ہمارا ایک شاگرد یا مرید تھا کہ اس کو یہ کشف حاصل ہوا تھا مگر اس کا گونگا پن محفوظ نہ رہا۔ لہٰذا اس کو مرتبۂ حیوانیت کا تحقق نہ ہوا۔

جب مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اس مقام میں قائم کیا تو میں نے اپنی حیوانیت کا پورے طور پر تحقق حاصل کیا۔ میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ آنکھوں سے دیکھتا اور منہ سے بولنا چاہتا تو بول نہ سکتا (تھا)۔ گونگے جو بات نہیں کر سکتے ان میں اور خود میں، میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔

جب انسان مقام حیوانیت سے ترقی کرتا ہے تو عقلِ مجرد عن المادّہ (یعنی اس کا دماغ بالکل یوں جیسے عام سی شئے) ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایسے امور کا مشاہدہ کرتا ہے جو اصول و علتیں ہیں ان اشیا کی جو صور طبعی و عنصری میں نمایاں و ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ بطور علم ذوقی کے جان لیتا ہے کہ یہ حکم صورتِ طبعی میں کہاں سے ظاہر ہوا۔ اگر اس کو اس کا کشف ہو جائے کہ طبیعت ہی نفسِ رحمان ہے تو اس کو خیرِ کثیر مل گیا۔ عقل پر حکومت کرنے والی اتنی معرفت کافی ہے۔ اور وہ عارفین میں شامل ہو جائے گا۔ اور اس کو علم ذوقی سے (سورۃ الانفال کی آیت ۱۷ کے ابتدائی حصے) فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَـٰكِنَّ اللَّـهَ قَتَلَهُمْ کے معنیٰ معلوم ہو جائیں گے، {یعنی} تم نے قتل نہیں کیا لیکن اللہ نے اُن کو قتل کیا۔۔۔ حالاں کہ تلوار نے، ضارب (یعنی مارنے والے) نے، اور اس شخص نے جو لوہے کو تلوار کی صورت دی ہے یعنی لوہار، نے قتل کیا ہے۔ اور ان تینوں کے مجموعے سے قتل واقع ہوا۔ عارف چیزوں کو ان کی اصلوں اور صورتوں کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس شخص کی معرفت تام ہوتی ہے، اگر نفسِ رحمانی کو بھی دیکھ لے۔ اس کا بھی مشاہدہ ہو جائے تو اس کی معرفت، تام بھی ہے اور کامل بھی۔ پس اللہ تعالیٰ ہی کو دیکھے گا اور ہر مرئی کا عین دیکھے گا۔ پھر دیکھے گا (کہ) رائی {دیکھنے والا} عینِ مرئی {دیکھا ہوا} ہے۔ اتنا عرفان کافی ہے۔ وھو الموفق والھادی (اللہ ہی ہمارا ثالث ہے اور ہماری رہنمائی کرنے والا ہے)۔